

مقالات

اختلافی مسائل اور ان کی نقطہ عدل

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(ماخوذ از حجتہ اللہ البالغہ)

اب ہم موجودہ مسائل مہمہ میں سے تیسرے سلسلہ پر جو قرآن و سنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کیلئے کتاب و سنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں یہ سب اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے، اور انسانی زندگی میں پیش آنیوالے عام واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے، یہی مقام اجتہاد ہے۔ اس استعداد اور قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں:-

(۱) کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ و غریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ امام احمد بن حنبل کا خیال ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ اس ملکہ کے حاصل کرنے کیلئے بس یہی تفکر اور تتبع کافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کیلئے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت و ادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ ائمہ سلف متعارض نصوص میں جمع و تطبیق کی صورت کس طرح

پیدا کرتے تھے اور ان کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

(۲) کبھی یہ قابلیت اصول تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتد بہ حصہ پر اس کی نظر ہو، تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے۔ یہ طریقہ اہل تخریج کا ہے۔

(۳) تیسرا راستہ جو مذکور بالا دونوں راستوں کی بہ نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن و سنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصولی اور اجماعی مسائل اور ان کے تفصیلی دلائل کا علم اسے باسانی حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو، ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو، ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دے سکتا ہو، لوگوں کے طریقہ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تیز کر سکتا ہو، خواہ اس کے اندر وسعت نظر اور تبصر کے وہ شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کیلئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کیلئے جائز ہے کہ مختلف رایوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، اور دو مختلف مذہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب کی اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے دینی تلفیق کرے، اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کر دے جو اگرچہ معتد میں کے نزدیک قابل قبول رہی ہوں لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انہیں غلط پائے۔ اسی درجہ سے تم دیکھتے ہو کہ جن علما کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا، وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور اکابر سلف کی آراء میں موازنہ کر کے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب اجتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ و تقسیم ہیں، اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کیلئے آدمی کا مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ میں کیوں مستحب

اور ناقابل قبول دکھائی دیتا ہے؟ تحقیق کا مقصود تو محض ظن غالب کے حصول تک ہے اور اسی پر تکلیف کا دار و مدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنہیں اللہ نے اتنی فہم و بصیرت عطا نہیں کی ہے کہ قرآن و سنت پر غور کر کے بطور خود مسائل کی چھان بین کر سکیں، انہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے عام معاملات میں مذاہب مروجہ کے ان طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنہیں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے۔ لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادر الوجود ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں۔ بس یہی ان کے لیے سب سے معصوم راہ ہے۔

اسی خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علماء و محققین کو پایا ہے اور تمام ائمہ مذاہب اپنے پیروؤں کو اسی کی وصیت بھی کی ہے۔ ایوانیت و ابجاہر میں ہے:

”ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان ابن ثابث کی (یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم و فہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اسکی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہوگی۔“

”امام مالک رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال و قسم کے ہوتے ہیں کچھ نے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ کی ذات معصوم ہے۔“

”حاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایہ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحب کیا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنی سے اپنے فرمایا کہ ابراہیم میری ہر بات کی کو رائے تقلید نہ کرو بلکہ بذات خود اس میں غور کر لیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے“

”امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور رسول کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی۔ جس طرح انہوں نے کتاب و سنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تا وقتیکہ وہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جسکے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس میں وہ تمام ائمہ جنکی عموماً پیروی کی جاتی ہے، متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ ائمہ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی۔ لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز، مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کر کے فتویٰ دے، الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو“

”امام ابو یوسفؒ اور ذفر وغیرہ علماء سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ

نہ معلوم کر لے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔“

”عصام ابن یوسف سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابو حنیفہ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اسکی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جوہم اور دقتِ نظر حاصل تھی ہمیں حاصل نہیں، وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے ہو مجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں۔“

”ابوبکر الاسکاف البغنی سے پوچھا گیا ”کیا ایسے شخص کیلئے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو، جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رکا رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجہ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجہ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کر سکے تو وہ مجتہد ہے۔“

ابن الصلاح کا قول ہے کہ ”اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر وہ اپنے اندر اجتہاد مطلق کی یا خاص اسی ایک سکہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کر دے۔ لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فرد تر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گذر رہی ہے تو بھی حدیث

ہی کا اتباع کرنا چاہیے بشرطیکہ امام شافعی کے بجائے کسی اور امام نے اس پر عمل کیا ہو، کیونکہ اس صورت میں اس دوسرے امام کا اتباع امام شافعی کے اتباع کا قائم مقام ہو جائیگا۔ یہ ابن الصلاح کی رائے ہے اور امام نووی نے بھی اسی کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیاتوں نے اختلاف اور شقاق کی زنگہ بنا لیا ہے وہ فقہار کا باہمی اختلاف ہے۔ حالانکہ ان اختلافات میں اکثر، (خصوصاً جن میں صحابہؓ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں، مثلاً تشریق اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف، نکاح محرم درج کیلئے احرام باندھ لینے والے) کے جواز کا اختلاف، ابن عباسؓ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف، بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ) فی نفسہ آپس میں نہ کوئی اساسی تباہی رکھتے ہیں اور نہ انکی اصل مشروعیت میں اکتہ سلف کا کوئی اختلاف ہے۔ بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک... کو دوسرے پر ترجیح دینے میں ہے۔ یہ سبھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب سنت سے مستنبط ہیں۔ لیکن چونکہ ہر شخص کی نظر تحقیق اور قوت اجتہاد جدا گانہ ہوا کرتی ہے، اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوح تھا اس کے نزدیک راجح اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر قرأت کو نو اور دیکھو کہ قرآن ایک ہی لفظ اور آیت کی قرأت میں کس قدر مختلف ہیں یہی حال علمائے فقہ کے اختلاف کا ہے، چنانچہ وہ اکثر اپنے اختلاف کی تعمیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی، یعنی وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے۔ کون ہے جو ان کے کسی فرد پر کبروی اور سنت بنوی کی مخالفت کا الزام عائد کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتاء کے

فنتوں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ تم اقسام کے اختلافی مسائل کے بارے میں تمام ائمہ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیل کر بیان کرنے اور تمام اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ ”یہ میرے خیال میں احوط طریقہ ہے“ ”وہ رائے مختار ہے“ ”وہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے“ اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ ”ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے“ اس کے شواہد المیسوطہ، آثار محمدؐ اور اقوال شافعیؒ میں بے شمار موجود ہیں۔ یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمہ صافی شقائق و نزاع کے مہلک جراثیم سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہاد کی اختلافات جامہ ملت کیلئے مقراض کا کام نہیں دے رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفان سیلاب آیا۔ نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی۔ لوگوں نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے حرف نظر کر کے حرف ایک پہلو کو لے لیا۔ اب اختلافات کی نوعیت پہلی سی نہ رہی۔ انہیں بے حد اہمیت دے دی گئی۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آگئی۔ لوگوں کا ذوق تحقیق، جمود سے بدل گیا اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے اپنے ائمہ کے مذاہب ہمیشہ قائم رہنے کی ناکید منقول ہے، سو یہ یا تو ایک رحمان فطری کی بنا پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی فتنہ اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ ہم عام رسوم و رواج کے اندر بھی اس رحمان فطری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل تردید تھے۔ یہ اور اسی قسم کی اور وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی سرشاری میں انہوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔

اب ذرا ان اختلافات کی اہلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذ جنگ قائم ہو رہا ہے اور دیکھو کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کونسا اسوہ چھوڑا ہے؟ ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے، کچھ لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو تے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اسکی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ یہ اور اسی قسم کے میسوں اختلاف موجود تھے لیکن اسکے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کسی نے کسی کی اقتدار سے کبھی انکار نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہ اور انکے تلامذہ اور امام شافعی وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے۔ نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ اس نے حجامت دے پچھنے لگوانے کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی۔ امام ابو یوسف کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضو لازم ہے مگر امام مالک کے مذہب میں لازم نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل حجامت اور نکیر کو ناقص وضو مانتے ہیں، لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپ نے جواب دیا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں؟ دجن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)

روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباس کے مذہب کے مطابق نکیریں کہا کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعیؒ نے مقبرہ امام ابو حنیفہ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب کے دعائے قنوت کو ترک کر دیا۔ اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام شافعیؒ (امام ابو یوسفؒ) کے متعلق البرزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کویں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ وہ تو پھر اس دقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو وقتہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماہ کثیر کا ہو جاتا ہے۔“

امام خجندیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے دو ایک برس کی نماز چھوڑ دی ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کرے تو پھر وہ کس طرح نماز کی قضا کرے؟ آیا امام شافعی کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق؟ جواب دیا کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضا کر لیا جائے، بشرطیکہ اس کے جواز کا اعتقاد رکھتا ہو۔

جامع الفتاویٰ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے یہ کہا کہ ”اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق، اس پر طلاق، اس پر طلاق“ یعنی تین طلاقیں دیں،“ پھر اس نے کسی شافعی المذہب فقہ سے فتویٰ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ ”اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو مانی جائے گی،“ تو اس سلسلہ میں امام شافعی کی اقتداء کرنے میں اس کیلئے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اکثر صحابہ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ ”اگر کوئی فقہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں طلاق دے کہ ”انت طالق“ التبتہ اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسے طلاق کو تین طلاق یعنی طلاق

با آن سمجھتا ہوا لیکن قاضی وقت فیصلہ کر دے کہ یہ طلاق رجعی ہے، تو اُس کے لیے رجعت کرنے کی گنجائش ہے۔“

اسی طرح تحریم و تحلیل اور معاشرۃ اور لین دین کے اُن تمام معاملات میں جنکے اندر فقہاء اور ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دارالقضاء سے اسکے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔

(باقی)

اشاعت خاص ترجمان القرآن

رجب ۱۴۰۷ھ کی اشاعت، ترجمان القرآن کی اشاعت خاص ہوگی جس میں شعبان ۱۴۰۷ھ سے اب تک کے تمام دو اشارات، ”یکجا شائع کیے جائینگے۔ ان مضامین کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے، اور بہت اہم مباحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ غمیہ کے طور پر جناب ساربان کا مضمون ”متاع کارواں“ بھی اسکے ساتھ ہوگا۔

پچھلے مضامین کا مجموعہ جو ”مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش“ کے نام سے شائع ہوا تھا، آٹھ ہزار کی تعداد میں طبع کیا گیا تھا اور قریب قریب سب نکل گیا۔ اس مقبولیت کو دیکھ کر یہ دوسرا مجموعہ سات ہزار کی تعداد میں طبع کیا جا رہا ہے۔ ضخامت تقریباً ۱۶۰ صفحوں کی قیمت فی نسخہ ۵ روپے۔ ایک روپیہ میں ۴ نسخے۔ ۲ روپے میں سو نسخے علاوہ محصول کا۔ جو حضرات اسکی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہوں وہ مہتمم شعبہ اشاعت دارالاسلام کے پاس فرمائش بھیجیں۔